جدید افسانے کے تناظر میں مستنصر حسین تارڑ کی افسانہ نگاری

مہر ونہ لغاری*

Abstract:

Mustansir Hussain Tarar is a well known Urdu writer and a Multi dimensional personality. Actor, compare, T.V. Anchor, Tourist, novelist, columnist and a short story writer. The article is an analytical study of Mustansir's short story writing with the fact that this part of His fiction writing is mostly neglected. His stories contained mostly the modern techniques of modern Urdu short stories. The researcher has analyzed his short stories in the perspective of modern Urdu short story techniques and its locale. Tarar has made his short stories more impressive through the modern techniques as myths, folklore, absurdity and his vast knowledge of all the world and history. His short stories are a mirror to his age of Marshal laws and internationally power politics. All of his fiction writings style can be seen in his short stories.

یکم مارچ ۱۹۳۹ء کو لاہور میں پیدا ہونے والے مستنصر حسین تارڑ ایک ایسے کل وقتی ادیب اور متنوع جہت شخصیت ہیں جو ادب کی مختلف اصناف مثلاً ناول، افسانہ ڈرامہ، ناولٹ، کالم نگاری، کے میدانوں میں نہ صرف اپنا سکہ جما چکے ہیں بلکہ وہ شوبز کی بھیانک جانی مانی ہستی ہیں ٹیلی ویژن سے وابستہ رہے۔ کمپیرنگ کی، ڈراموں میں کام کیا۔ تاہم مستنصر حسین تارڑ کا پہلا عشق مسافرت، سیاحت اور سفرناموں سے رہا۔ اور اس سلسلے میں اُنکے سفر ناموں کی مقبولیت اور خود انکی وجہ مقبولیت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ ان کا شمار اردو ادب کے ایسے فعال ادیبوں میں

* شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج برائے خواتین، ڈیرہ غازی خان۔

ہوتا ہے جن کی تخلیقات تواتر سے شائع ہوتی ہیں۔حال ہی میں مستنصر حسین تارڑ کے دو نئے ناولوں کو ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔''خس و خاشاک زمانے'' اور''اے غزالِ شب'' انکے دونوں ناولوں کو خاصی پذیرائی ملی ہے

ان کے کالم اردو انگریزی اخبارات کی زینت بن رہے ہیں۔اور جو اردو ادب کے قارئین میں بے حد مقبول ہیں۔یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مستنصر حسین تارڑ کی ناول نگاری،سفر ناموں پر بھی کئی مقالات،تنقیدی مضامین لکھے جا چکے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں لیکن ان کی دیگر ادبی جہات کو ان کے ادبی سرمائے سے عموماً علیحدہ رکھا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں پر بھی بہت کم لوگ متوجہ ہوئے ۔حالانکہ مستنصر حسین تارڑ کی افسانہ نگاری کا آغاز بھی جدید اردو افسانے کے آغاز کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔اس لیے ان کے افسانوں میں بھی عصری تاریخ کی جھلکیاں موجود ہیں۔مستنصر کے افسانے جدید اردو افسانے میں اپنا ایک مقام اور اثر پذیری رکھتے ہیں۔ان کے سفر نامے اور ناول ان کا مقدم تخلیقی حوالہ سہی، اور وہ بطور کالمسٹ، ڈرامہ نگار، اداکار اور ٹیلی ویژن پیشکار کے دنیا بھر میں مقبول و معروف سہی اس کے باوجود وہ بحیثیت افسانہ نگار بھی افسانہ کو ایک نئی تخلیقی جہت سے ضرور روشناس کراتے ہیں۔جسکو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔فرزانہ سید لکھتی ہیں

> ''ان کے افسانے اور ناولٹ بھی ان کے سفر ناموں کی طرح نئے تجربوں کی گہرائی اور اسلوب کی انفرادیت لیے ہوتے ہیں ان کے ادبی تصورات اور رجحانات کی بنیاد انسان دوستی اور روشن خیالی ہے۔''(۱)

لیکن اس کے باوجود مستنصر فن افسانہ نگاری کی طرف اس قدر سنجیدگی سے متوجہ نہیں ہوئے۔ڈان میں ایک انٹرویو میں وہ خود تسلیم کرتے نظر آتے ہیں

> ''Answering why he has only one collection of short stories, titled Siyah aankh mein tasweer, and many novels, he says "Whenever I begin writing a short story, I lose control over its characters, settings and happenings and it spreads into a novel.''(۲)

فنی و موضوعاتی حوالے سے مستنصر حسین تارڑ کی کہانیاں کسی ایک معاشرے یا سماج سے جڑی ہوئی نہیں ہیں بلکہ ان کے افسانوں میں مختلف طبقوں، معاشروں اور ذہنی پس منظر کے حامی لوگوں کی نمائندگی ملتی ہے۔اور یہ ہی دراصل اس کے افسانوں کی دلچسپی کا خاص پہلو ہے۔کیونکہ مختلف ذہنی پس منظر کو بیان کرنا افسانہ نگار کی عظمت ہے چونکہ تارڑ کے تجربات متنوع ہیں۔لوگوں سے میل ملاقات کرنا اس کا مشغلہ بھی ہے اور شوق بھی۔پھر دنیا کی سیاحت میں وہ خود بھی خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کر چکا ہے،اس لیے وہ دنیا کے مختلف معاشروں میں سماج کی

کجیوں اور تضادات کو بڑے لطیف پیرائے میں محسوس کرتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر ان کے افسانوں کی بدیسی فضا کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں

> ''مستنصر حسین تارڑ اپنے افسانوں میں غیر ملکی فضا کی خوشبو لے کر آئے۔ خوبصورت اسلوب، تکنیک کا نکھرا ہوا شعور اور اجنبی اجنبی مگر مانوس مانوس سے کردار ان کے فن کی اساس بنتے ہیں''(۳)

مستنصر حسین تارڑ کے پاس عام مصنفین کے مقابلے میں متنوع افراد کے جذبات ہیں اور اندرونی حیثیت سے زیادہ معلومات ہیں کیونکہ بطور سیاح اس نے تھیلا کمر پر ڈالا ہے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ نفسیات کا مطالعہ ایک اور چیز ہے۔ اور مختلف کلچر کا مطالعہ ایک اور ہی جہت سے روشناس کراتا ہے۔ یوں تارڑ کے پاس عام انسانی زندگی کا تجربہ دوسروں سے مختلف ہے۔ پھر زندگی کے حوالے سے اس کا ایک یک رخا تصور ضرور ہے۔ لہٰذا روز وشب کے ایک جیسے معمولات سے وہ گھبراتا ہے۔ اور ایک اداسی اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کی کہانیوں میں دریا ایک مستقل استعارہ ہے۔ ان کی کہانیاں ملکیت سماجی جبر اور آمریت کے خلاف ہیں۔ بڑھتی ہوئی عمر مستنصر کی کہانیوں میں فنا اور اداسی کے تصور سے جڑی ہوئی ہیں۔ وقت کا تصور ان کے ہاں ایک ایسی بے رحم حقیقت اور اس ازلی غم سے جڑا ہوا ہے جس کا سامنا ہر ذی روح اور ذی حس انسان کی زندگی اور تخلیقات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ عارف وقار کو دیے گئے ایک انٹرویو میں وقت کے حوالے سے اپنے احساسات بطور ایک تخلیق کار و فنکار یوں قلم بند کراتے نظر آتے ہیں۔

> 'وقت کی تیز و تند آندھی ٹوپیوں میں لگے سرخاب کے سارے پر اُڑا کے لے جاتی ہے۔ بڑے بڑے اداکاروں، پیشکاروں ناول نگاروں، ڈرامہ نویسوں اور سیاحوں کے نام وقت کی گہری دھند میں غائب ہو جاتے ہیں۔ سمے کے بہتے دھارے میں مجھ جیسے پر کاہ کی کیا حیثیت ہے؟۔۔۔لیکن اگر یہ ناممکن ہو گیا اور مستقبل کے کسی دیوانے نے مجھے ڈھونڈ نکالا تو میری خواہش ہوگی کہ مجھے ایک ایسے قلم کار کے طور پر یاد رکھا جائے۔ جو لکھائی کی میز پر جھکا، تمام عمر اس دھن میں ایک مزدور کی طرح مشقت کرتا رہا کہ قاری تک رسائی کا اسم اعظم ہاتھ آ جائے''(۴)

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مستنصر حسین تارڑ قلم کے مزدور ہیں اور ان کے پاس ایک ایسا طاقت ور بیانیہ اور تکلم کی وہ قوت ہے جہاں مصنف کے لیے کسی بھی خیال کو لفظ کا روپ دینے کے لیے تجربے کی کٹھالی سے نہیں گزرنا پڑتا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اشفاق احمد کے بعد اگر کسی بھی شخص کو طاقتور بیانیہ ملا ہے تو وہ مستنصر ہے اور یہ بھی عجیب اتفاق

ہے کہ دونوں کے اندر کئی اقدار مشترک ہیں جن میں شوبز کے متنوع شعبوں میں دونوں کی مقبولیت، مضبوط بیانہ، اور دونوں کا ذریعہ معاش بھی ادب سے وابستہ ہونا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ اپنے افسانوں میں ایک اور چیز جسے وہ جگہ دیتے ہیں وہ توہمات ہیں جو مختلف علاقوں میں مختلف ہوتی ہیں مثلاً چیل کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ گھر کی ممٹی پر بیٹھے اور گھر تباہ ہو جائے گا۔ اور اسی طرح مور کے بارے میں ہے کہ وہ موت کی علامت ہے جب کہیں جنگل میں سے گھر آ جائیگا تو وہاں موت ہو جائیگی۔ بہر حال مستنصر کے افسانوں میں یہ چیز بھی رہتی ہے۔

پھر چونکہ اس کی معلومات بہت وسیع ہیں اس لیے وہ مختلف اساطیری حوالوں سے اپنی کہانیوں میں گہرائی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ٹیلی ویژن سے جڑی کچھ مقبول ٹرکس سے بھی کام لیتا ہے۔ مثلاً اس کی کہانیوں میں بعض اوقات ایک جملہ یا دو تین سطریں بار بار دہرائی جاتی ہیں

یہ بھی ایک دلچسپ امر ہے کہ مستنصر حسین تارڑ اپنی کہانیوں میں اپنی ذات کے گرد ایک رومانی ہالہ بھی بنتے ہیں البتہ اس کے علاوہ ان کی کہانیوں میں ابلاغ کی صفت موجود ہے۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں بیانیہ اور علامتی تکنیک دونوں استعمال کی ہے۔ لیکن اس کے علامتی افسانے جو جدید افسانے کی روایت کا تسلسل ہیں اس لحاظ سے یقیناً اہم ہیں کہ ان کا تاثر قاری پر خاصی دیر حاوی رہتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ اپنے افسانوں میں کوئی تشنہ طلب سوال یا خیال نہیں چھوڑتے۔ بلکہ قاری کو سوچنے کی دعوت دینے کی بجائے اپنا نقطہ واضح کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے کردار عام طور پر بہت بولنے والے کردار نہیں ہیں مگر جب بھی ان کرداروں کے توسل سے مصنف اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہیں تو وہ جملے بہت مؤثر ہوتے ہیں تارڑ کا اب تک ایک ہی افسانوی مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ ''سیاہ آنکھ میں تصویر'' سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور نے ۱۹۹۹ء میں اسے شائع کیا۔ اس افسانوی مجموعہ میں تقریباً ۱۶ افسانے شامل ہیں اور تمام کے تمام افسانے ایک مختلف منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں مستنصر نے بیانیہ اور علامتی دونوں اسلوب کا استعمال بہت خوبی سے کیا ہے۔ پھر مستنصر کے اسلوب پر رومانوی عناصر بھی پائے جاتے ہیں مستنصر کا پہلا حوالہ یعنی سفر نامہ ہے اس دشت کی سیاحی کے اثرات بھی ان کے افسانوں پر نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ایک تو ان کے افسانے کسی مخصوص معاشرت کے عکاس نہیں ہیں بلکہ مختلف لوکیل لیے ہوتے ہیں دوسرے ان کے کردار پردیسی یا سیاح ہوتے ہیں یا پھر سیاحت کے شائق ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں

''نگر نگر گھومنے والے اس شخص کے افسانوں میں عموماً ہمارے دیہی زندگی کے کردار یا فضا ملتی ہے۔جس میں خالص پاکستانی مٹی کی سوندھی خوشبو موجود ہے۔''(۵)

لیکن انوار صاحب کی اس رائے سے اتفاق کرنے میں تھوڑا تامل یوں ہے کہ پورے افسانوی مجموعہ میں میں محض دو افسانے ''کوٹ مراد'' اور ''لوہے کا کتا'' میں ہی پاکستان کی دیہی فضا ملتی ہے۔جس میں ''لوہے کا کتا'' ایک علامتی افسانہ ہے۔

اس افسانوی مجموعہ کا پہلا افسانہ'' آدھی رات کا سورج'' ہے اس حوالے سے فرزانہ سید لکھتی ہیں

''مستنصر کا پہلا افسانہ آدھی رات کا سورج ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا تھا اس کے بعد وہ سال بھر میں ایک دو افسانے ہی تحریر کرتے ہیں۔لیکن ان کے افسانے زیر بحث رہتے ہیں کیونکہ ان کی فضا بھی بالکل مختلف ہوتی ہے۔ان کے افسانوں میں آج کی سیاسی و سماجی صورتِ حال نمایاں ہوتی ہے۔وہ پورے عہد کے جبر اور تشدد کو محسوس کر کے لکھتے ہیں۔اور سیاہ آنکھ میں تصویر، بادشاہ اور کوٹ مراد اس کی واضح مثالیں ہیں۔''(۶)

تارڑ کا یہ افسانہ موجودہ دور کی تیزی، بڑھتی ہوئی مصروفیات اور رات دن کے چکر میں مقید لوگوں کی کہانی ہے۔جس میں سب سے زیادہ نقصان بڑھتی عمر کے انسانوں کا ہے۔جن کی زندگی ایک بوجھ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔افسانہ واحد متکلم کی تکنیک میں ہے۔راوی کی ملاقات ایک بوڑھے سیاح رینے کلاڈ سے ہوتی ہے۔رینے کلاڈ راوی کے چھوٹے بھائی مبشر کا شناسا ہے۔اور مغرب میں عام رواج پانے والے طرزِ زندگی کے مطابق اپنی بیٹی کی مصروفیت، آزادانہ طرزِ زندگی (جس میں بزرگوں کا وجود ایک پابندی اور فالتو ذمہ داری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔) کے باعث بیس سال تک اولڈ پیپل ہوم میں رہائش پذیر رہنے کے بعد آخر کار پیرس میں موجود اپنے فلیٹ کو بیچ کر دنیا کی سیاحت پر نکلتا ہے۔دو سال بعد افغانستان کے راستے پاکستان پہنچتا ہے۔بڑھاپے کو کس طرح تخلیقی اور تعمیری حوالے سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔نیز آجکل کے مادی دور میں انسان کس طرح لگی بندھی مصروفیات اور شب و روز کا اسیر ہو کر رہ گیا ہے۔یہ افسانہ بڑی سادگی اور خوبصورتی سے اس پہلو کو بیان کرتا ہے۔

مشرق اور مغرب کا طرزِ زندگی، زندگی کی ترجیحات ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں۔مشرق پرانی روایات، اقدار اور مذہب کا اسیر ہے اس لیے نئے پن کے ایڈونچر سے محروم ہے۔پامال راستوں پر چلنے کا پابند ہے۔۔بڑے بوڑھے اس معاشرے میں ایک خاص مقام اور درجہ رکھتے ہیں۔لیکن یہاں کے لوگ کرداری حوالے سے مجہول ہیں۔اس کے مقابلے میں مغرب مادر پدر آزاد معاشرہ ہے۔لوگ ہر دم متحرک اور نئی کھوج کی تلاش میں مگن رہتے ہیں۔ان دونوں سماجوں میں تضادات کے باوجود مصنف کو مغرب کے قائم کردہ اولڈ پیپل ہوم اور

ہمارے معاشرے کی گھٹن، لگی بندھی روٹین میں ایک مماثلت نظر آتی ہے۔مشرق کا سماج بھی اولڈ پیپل ہوم کی مانند ایک سکوت اور گھٹن کا شکار ہے۔جس میں تفریح سے محروم زندگی میں تخلیقت کے سوتے خشک ہو چکے ہیں۔

پھر مستنصر کا اپنا تخلیقی حوالہ چونکہ سفر نامہ نگار اور سیاح کا ہے۔لہذا کہانی کا تانا بانا ایک سیاح کے گرد بُنا گیا ہے۔تارڑ کے افسانوں میں سیاحت کا جذبہ ان کے سفر ناموں میں افسانوی رنگ کی مانند موجود رہتا ہے۔عموماً ان کے افسانون کے کردار کہیں سفر سے آتے ہیں یا پھر سفر کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔اور یہ نفسیاتی حوالے سے ایک معنی خیز اشارہ ہے۔کہانی کا انداز سادہ اور خوبصورت ہے۔روزمرہ زندگی کی جھلکیاں مصنف افسانے کے آغاز میں ہی دکھا دیتا ہے۔جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آجکل کے دور کا افسانہ ہے اور ہمارے بیچ کے کردار ہی یہاں موجود ہیں۔افسانے میں یورپی معاشرے اور پاکستانی معاشرے میں لوگوں کے کردار میں جو تضاد پایا جاتا ہے۔اور جو ترجیحات کا فرق پایا جاتا ہے۔وہ بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔مغرب میں سب سے قیمتی سرمایا وقت ہے جبکہ مشرق میں سب سے بے مصرف چیز وقت ہے۔عام طور پر یہ ایک مقبول عام رویہ ہے۔کہ جب افسانے کا کوئی کردار مصنف سے نہیں سنبھلتا تو وہ اسے افسانے کے اندر ختم کر دیتا ہے۔اس افسانے میں بھی یہ ہی ہوتا ہے۔رینے کلاڈ کے سفر کے اختتام پر اس کی زندگی بھی اختتام پذیر ہو جاتی ہے اور یوں وہ بے مصرف زندگی کی اذیت سے جان چھڑا لیتا ہے۔اس کے مرنے کے بعد مصنف کو یہ احساس ہوتا ہے۔کہ دراصل جس سماج میں وہ زندہ ہے وہ بھی ایک اولڈ پیپل ہوم ہے۔

> ''رینے کلاڈ خوش قسمت تھا جو ایک مشترکہ تابوت میں سے نکلنے میں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔میں خود بھی تو ایک عظیم تابوت میں دفن ہوں۔مجھے بھی اولڈ پیپل ہوم کی طرح زندگی کی تمام سہولتیں میسر ہیں۔۔۔لیکن مجھے معلوم ہے کہ ہم یہاں صرف مرنے کے لیے آتے ہیں۔موت کے انتظار میں اس ماحول میں میرا دم گھٹتا جا رہا ہے۔میں بھی بھاگ جانا چاہتا ہوں۔مجھے اپنی موت اپنے ذاتی تابوت کی تلاش میں جانا ہے۔میرے اس عظیم تابوت میں بھی بزرگی کا معیار قیام کی طوالت پر منحصر ہے۔میرا تعارف مستنصر حسین تارڑ۔۔۔تینیس سال۔۔۔۔''(۷)

''سیاہ آنکھ میں تصویر'' یہ اس افسانوی مجموعہ کا دوسرا افسانہ ہے۔یہ افسانہ خانہ بدوشوں کے پس منظر میں ایک آمر کی بڑھتی ہوئی جارحیت کے خلاف احتجاج ہے۔اسپین کے جنرل فرانکو کی افواج نے غرناطہ کے شہر البسین کا محاصرہ کر لیا تھا۔اور شہر کی طرف جانے والی تمام پائپ لائینیں منقطع کر دی گئی تھیں۔بچے اور شہر پانی کے لیے بلک رہے تھے۔لارنزو ایک خانہ بدوش ہے اور اس محاصرے کے دوران اپنے دو بیٹوں، بیوی اور ایک بیٹی آدے لا کے

ساتھ البسین کی پہاڑیوں کی ایک غار میں رہتا ہے۔ وہ ایک شرابی اور سہل پسند خانہ بدوش ہے۔ اس کے بیٹے شہریوں کی جیبیں کاٹتے ہیں اور بیوی اور بیٹی کو اس نے عصمت فروشی کے کام پر لگایا ہوا ہے جس کے بعد گھر کے لیے راشن اور اس کے لیے شراب کا انتظام ہو پاتا ہے۔ مصنف کی انسان دوست بصیرت ہے جو لارنزو کی تمام تر بے حسی کے بعد بھی دردمندی کے اس جذبے کو ڈھونڈ نکالتی ہے جب جنرل فرانکو کے سپاہی شہر کی طرف جانے والی پانی کی پائپ لائن کاٹ دیتے ہیں اور بچے بوڑھے پیاس سے مرنے لگتے ہیں تو لارنزو بے چین ہو جاتا ہے

''بچوں کی زبانیں؟ لارنزو بوکھلا گیا۔ لیکن یہ تو ظلم ہے ان کو تو پانی دینا
چاہیئے۔ بچے نیشنلسٹ یا ری پبلکن نہیں ہوتے۔ وہ تو صرف۔۔۔''

[سیاہ آنکھ میں تصویر، ص ۲۲]

وہ ایک ایسی خفیہ سرنگ سے واقف ہے جس کا ایک سرا دریائے درہ تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ وہاں سے پانی کے مشکیزہ بھر کر لاتا اور البسین کے باسیوں کو ایک ایک گھونٹ پانی میسر آتا رہا۔ اس پاداش میں جنرل فرانکو کے ملٹری ٹریبونل نے اسے صلیب پر لٹکا دیا۔ تب اس کے بیٹے اور بیٹی اپنے باپ کے قتل کا انتقام اپنی روایات کے مطابق جنرل فرانکو کی خصلت کے کسی اور ذی روح (سیاہ بُل) سے لینے کا فیصلہ کرتے ہیں۔

''ہم خانہ بدوشوں میں روایت ہے کہ اگر انتقام لینے کے لیے دشمن نہ مل سکے تو اس کی
خصلت کے کسی اور شخص کو موت کے گھاٹ اتار دو۔'' [ایضاً ص ۲۵]

مستنصر جبر اور آمریت کے بڑھتے ہوئے ہوس کے سائے سے نالاں ہے۔ اس افسانے میں وہ دکھاتا ہے کہ اصل قدر انسان کی ہے۔ انسانیت ہی زندگی کا منتہا و مقصود ہے۔ لہذا لارنزو جو ایک شرابی ہے۔ بیوی بیٹی کو عصمت فروش بنا دیتا ہے۔ بیوی کی کوکھ سے ناجائز بچوں کو تحفتاً دوسروں کو دے دیتا ہے۔ لیکن اس کے اندر کی بشریت اور انسانیت اب بھی قائم ہے۔ جسے نام نہاد انسانیت اور اخلاق کے علمبردار پامال کرنے میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں کرتے۔ پھر کچھ روایات ہوتی ہیں جو لوگوں کی زندگی میں اہمیت اختیار کر جاتی ہے جن کی پاسداری کا مادہ ہر کلچر میں موجود ہوتا ہے۔ اس افسانے میں بھی خانہ بدوشوں کا انتقام کا اپنا ایک انداز ہے جس سے ان کے اندر ضمیر کی خلش، دکھ، بے بسی اور انتقام کا کیتھارسس ہوتا ہے۔ کہ جنرل فرانکو اور سیاہ بل کی آنکھ میں موجود انسانی خون کی پیاس وہوس میں مماثلت تلاش کر لیتے ہیں اور یوں اس بل کو جان سے مار دینے کا عزم کرتے ہیں۔ بقیہ زندگی اس کے تعاقب میں گزار دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بالآخر سیاہ بل کا مالک بل ایک ذبح خانے میں بیچ دیتا ہے تب وہ بہن بھائی اسے ذبح کر کے اپنا انتقام پورا کرتے ہیں۔ اردو افسانے میں کیتھارسس کے لیے انتقام کا یہ کوئی انوکھا طریقہ نہ

تھا بلکہ منٹو کی سوگندھی بھی ہے جو ایک کتے کو اپنے ساتھ سلا لیتی ہے تو دوسری طرف ان کا افسانہ نعرہ بھی کچھ اسی قسم کی انتقامی روش کا اظہار کرتے ہیں۔

''پریم'' مستنصر کا ایک ایسا افسانہ ہے جو ایشیا میں موجود قلمی دوستی کی رومان پرور فضا میں لکھا گیا ہے۔اس افسانے کی معنی خیز بات یہ ہے کہ مصنف نے اپنی ذات کا حوالہ بطور افسانے کے مرکزی کردار کے طور پر دیا ہے۔اور یہ حوالہ ایک رومانی حوالہ ہے۔اور عموماً ان کی دیگر تصانیف میں بھی یہ عنصر خاصا نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔اب یہ بڑھتی عمر کی نفسیاتی تسکین کا جذبہ بھی ہوسکتا ہے۔

افسانے کی کہانی کا آغاز سادہ انداز میں ہوتا ہے۔مصنف کی قلمی دوستی ہندوستان میں رہنے والی ایک سکھنی لڑکی پریم سے ہوتی ہے۔ان کی دوستی پروان چڑھتی ہے اور پریم سے وابستہ افراد کے مشاغل اور روز وشب کے معمولات کا علم ہوتا ہے۔پریم ایک دراز قد لڑکی ہے نوجوان لڑکوں سے دوستی کرنا اس کا مشغلہ ہے۔مصنف سے خاصا دلی لگاؤ بھی رکھتی ہے۔اپنی شادی کی شاپنگ کے لیے اپنے منگیتر کے ساتھ یورپ جاتی ہے جبکہ مصنف بھی اس وقت سیاحت کی غرض سے اسپین میں ہوتا ہے پریم مصنف سے ملاقات کی چاہت میں اسپین جاتی ہے اور ایک کار حادثے کا شکار ہوجاتی ہے۔ہاسپٹل میں گیس ہیٹر آن کرتے ہوئے جل کر مرجاتی ہے۔پورا افسانہ ایک رومانی فضا میں لکھا گیا ہے۔جس میں مصنف نے کئی ٹریک استعمال کیے ہیں نتیجتاً افسانے کے اندر جو ایک اجتماعی قوت یا وحدتِ تاثر ہونا چاہئے وہ مفقود ہے۔پریم اور مصنف کی کتھا کے ساتھ ساتھ ایک نائیٹ knight کا قصہ بھی متوازی طور پر چلتا ہے۔جس کے ساتھ ساتھ مصنف کے ایک بھائی کی شہادت بھی اس قصے کی مماثل مگر متوازی ہو جاتی ہے۔لیکن ان تینوں ٹریک سے قصہ کے موضوع میں جو ایک معنویت ہے وہ واضح نہیں پاتی۔میرے نزدیک یہ افسانہ ایک کمزور افسانہ ہے۔کیونکہ افسانے میں ٹین ایج کا رومان، قصہ کی طوالت، اساطیری قصہ اور رقت کے منا ظر ڈالنے کے باوجود۔دلچسپی پیدا کرنے میں ناکام ہوجاتا ہے۔

''درخت'' ایک ایسا مختصر افسانہ ہے۔جس میں سیاسی جبریت کے خلاف ردعمل ظاہر کیا گیا ہے۔جدید افسانے کے رجحانات کا یہ افسانہ عکاسی کرتا ہے۔علامتی انداز میں لکھا گیا یہ افسانہ ایسے صاحب اختیار اور صاحبِ اقتدار لوگوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔جن کی جڑیں اس ملک میں نہیں ہیں لیکن جو اس ملک کی قسمت کے مالک بن بیٹھے ہیں یہ بظاہر تو سایہ دار درخت نظر آتے ہیں لیکن ان کی چھاؤں میں بیٹھنے والوں پر عذاب کا در کھلتا ہے جب ان درختوں کے نیچے بیٹھنے والوں پر حشرات اور کیڑے مکوڑوں کو حملہ ہوتا ہے۔اور یوں اس کے سائے تلے بیٹھنا محال ہوجاتا ہے۔افسانے میں ہی ان درختوں کے مقابل ایک سفیدے کا درخت ہے۔جس کے نیچے اگرچہ اس قدر

چھاؤں تو نہیں ہے لیکن اسکی خوشگوار خوشبو اور اس کا زمین سے جڑنا ایسی تبدیلی لاتا ہے جس سے چھاؤں نہ ہونے کے باوجود بھی لوگ اس کے نیچے بیٹھ کر سستانا پسند کرتے ہیں۔ یہ صورتحال دوسرے درختوں کے لیے پسندیدہ نہیں ہے۔ اور پھر ایک لکڑہارا اس درخت کو کاٹ دیتا ہے۔ ''میں لکڑہارا ہوں اس درخت کو کاٹ کر اس کی جگہ نئے درخت لگانا چاہتا ہوں'' ''مگر لکڑہارے صرف درخت کاٹتے ہیں لگاتے نہیں'' ''تم دیکھو گے کہ یہ لکڑہارا درخت لگاتا بھی ہے۔'' ''اس عمل میں تو برسوں لگ جائیں گے تب تک ہم کہاں سستائیں گے؟'' ''اس درخت اور لکڑہارے کے درمیان جو شئے حائل ہوتی ہے۔ کٹ جاتی ہے۔'' مسافروں کے ہاتھ خالی تھے انہیں پیچھے ہٹنا پڑا'' [ص۶۳] یوں اس ملک کی جڑیں مارشل لاء کے کلہاڑے سے کھوکھلی ہوتی رہتی ہیں اور کھوکھلے درخت اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں مگر ان کی چھاؤں ٹھنڈک سے محروم ہے۔ یہ علامتی افسانہ مارشل لاء کی فضا میں پروان چڑھنے والی آمرانہ سوچ کی طرف بڑا بلیغ اشارہ کرتا ہے۔

''بابا بگلوس'' کا موضوع اور لوکیل ہمارے معاشرے کے سیاسی پس منظر میں بڑھتی ہوئی شدت پسندی، انتقامی سیاسیت کے جذبہ کو پروان چڑھانے والی سیاسی جبلیں ہیں۔ ہمارے معاشرے میں برداشت کا عدم فقدان، ہمدردی وفلاح کے جذبہ میں کمی اور معاف کر دینے، بھلا دینے کی روش کا ترک کر دینے کا جذبہ سماج کو ایک ایسی انتہا پسندی کی طرف لے جا رہا ہے جہاں سماج و معاشرہ رو بہ زوال ہو رہا ہے۔ جب ملک میں اقتدار کے ایوانوں پر باریاں لگتی ہیں تو ہر صاحبِ اقتدار اس روش کو برقرار رکھتا ہے۔

مستنصر نے معاشرے کی اس گندگی کو سیاسی قیدیوں کے جیل خانے سے دکھایا ہے۔ اس سیاسی انتقام کے نتیجہ میں ''بابا بگلوس'' ایک بوڑھا قیدی بھی ہے جسکی تمام عمر اس قید خانے میں گزر گئی کہ اب وہ قید خانے کا ہی ایک ناگزیر منظر بن کر گیا ہے۔ اگرچہ اب وہ قیدیوں کا سا سلوک نہیں سہتا اور جیل حکام اسے فرار کرانا چاہتے ہیں لیکن وہ خود اس جیل سے نکلنے کو تیار نہیں کیونکہ اب باہر کی دنیا اس کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ جیل کے معمولات کا عادی ہونے کے باوجود وہ بعض اوقات گھٹن اور اداسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس وقت جیل کے اہلکار اسے باہر کی دنیا کی سیر کراتے ہیں لیکن ایک دن جب وہ باہر کی دنیا کی بے چینی اور سنگ دلی کا مظاہرہ دیکھتا ہے کہ لوگ سرِعام دی جانے والی پھانسی پر کسقدر پرجوش ہیں تب اس نظارے کے بعد وہ واپس جیل جانے سے انکار کر دیتا ہے کیونکہ اب زندگی ہر سطح پر ناقابلِ برداشت، سفاک اور بے رحم ہو چکی ہے اب جیل کے اندر اور باہر کی دنیا میں کوئی فرق نہیں رہا تھا ''نہیں اب باہر اور اندر کا موسم ایک ہو چکا ہے۔'' [۸۴]

''غلام دین'' مستنصر کا ایک ایسا افسانہ ہے جو فرد کے اکیلے رہ جانے کی نوید دے رہا ہے اور جدید

افسانے کی تکنیک پر لکھا گیا ہے۔اس افسانے پر وجودی حوالے موجود ہیں۔چونکہ مستنصر کا اپنا ایک نظریہ حیات ہے وہ انسانکو آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔اپنے خیالات،فکر ونظر کی آزادی کے فقدان اور اس کے ساتھ ساتھ روز مرہ کی لگی بندھی روٹین اسے ایک کرب میں مبتلا کر دیتی ہے۔مستنصر نے اس افسانے میں غلام دین کے کردار کے متوازی ایک اور کردار'' آئیون ڈینچ کی زندگی کا ایک دن''(۸) کے عنوان سے بھی لا کھڑا کیا ہے۔افسانے میں غلام دین کی زندگی اور آئیون ڈینچ کی جیل میں گزری ایک دن کی زندگی کے درمیان مماثلت تلاش کی ہے۔اپنی اصل میں یہ افسانہا یک ایسے شخص کی کہانی ہے۔جو زندگی اور معاشرے میں اکیلا رہ گیا ہے۔جس کی زندگی کے روز وشب کولہوں کے بیل کی طرف ایک پرچون کی دکان کے گرد گھوم رہے ہیں جو اپنی نصف بہتر سے بھی اپنے خیالات کو بانٹ نہیں سکتا،سماجی جبر اسے بزدل بنا رہا ہے۔وہ ذات کے خول میں سمٹتا جا رہا ہے۔اس کی زندگی میں مجہولیت ہے۔زندگی کے چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کی بجائے اس سے بچ بچا کر زندگی گزارنے کا وطیرہ اختیار کرتا جا رہا ہے۔وہ ایک بھتہ لینے والے انسپکٹر کو رشوت چاہنے کے باوجود نہیں دے پاتا۔ساتھ ہی ساتھ دونوں ٹریک ایک دوسرے کے متوازی چلتے رہتے ہیں۔افسانہ انسان کے شب وروز کا قصہ ہے فرد اپنی شناخت کھو کر محض مادی ضروریات کے لیے چلتا رہتا ہے،اس روٹین میں ایک بہترین دن وہ ہوتا ہے۔جو بغیر کسی گڑ بڑ کے گزر جاتا ہے۔تب وہ صابر اور مطمین ہوتا ہے لیکن آنے والا ہر دن پھر ایک مقابلہ اور مسابقت کے ساتھ آن موجود ہوتا ہے۔یہ جملے دیکھیے

> ''میں اب بھی بہت سوں سے بہتر ہوں۔۔۔کتنوں سے؟ مجھے کیا پتہ؟ میں بہتر ہوں۔۔۔سو جاؤ۔۔۔وہ مطمئن ہو کر سو گیا۔اس روز وہ بے حد خوش قسمت رہا تھا۔بیوی کے ساتھ کوئی خوفناک قسم کا جھگڑا نہیں ہوا تھا اس دکاندار نے بعد میں اپنے طور پر انسپکٹر کو بیس روپے دے کر تمام چلان کٹوا دئے تھے۔کھانے کے بعد اسے ایک پیالہ چائے بھی ملی تھی وہ نو کی بجائے آٹھ بجے والی بس میں بھی سوار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔تم اس کی کن کن نعمتوں کا شکر ادا کرو گے اس کا دن مکمل ہو گیا تھا وہ مطمئن ہو کر سو گیا''[۹۶]

مستنصر نے اپنے افسانے ''آکٹوپس'' کو موت اور فنا کی علامت بنایا ہے۔افسانے کی فضا میں خوف،حیرت،شک کے عناصر چھائے ہوئے ہیں یہ افسانہ مارشل لاء لگنے کے بعد ملک کے گلی کوچوں کے حال و احوال کا ایک ویژن اپنے اندر رکھتا ہے۔مارشل جبر واستبداد کا دوسرا نام ہے۔جو انسان کی ذہنی ونفسیاتی کیفیت کو بری طرح متاثر کرتا ہے۔جب انسان پر پابندیاں عائد ہو جائیں کہ اپنے ہی ملک کے گلی کوچوں میں نہ نکلیں جب محافظ ہی غاصب بن جائیں،جب ان کی گولیاں گھروں سے باہر نکلنے کی پاداش میں جسموں سے پار ہو جائیں یہ

افسانہ بھی وجودیت کے اثرات اپنے اندر رکھتا ہے۔ جب ایک فرد معاشرے کی تشکیک اور بے رحمی کے بعد لایعنیت کا شکار ہے اور تنہائی محسوس کر رہا ہے۔

پابند معاشرے میں افسانے کا جو اسلوب بنتا ہے۔ یہ افسانہ اس اسلوب کا حامل ہے۔

''ان شکستہ فرشوں اور اکھڑے ہوئے پلستروں والے کمروں میں ایک پھول بدہیئت عورت کی گود میں ایک رنگین بچہ ہوتا ہے۔ وہ ہر روز باغ میں ایک پھول کو جو رنگین بچہ ہے اپنی بدہیئت عورت کے پاس لے جاتا ہے جو اس کا کمرہ ہے۔'' [ص ۱۰۱]

''باشاہ'' مستنصر کا ایک ایسا افسانہ ہے جو تیسری دنیا کے مسائل اور تیسری دنیا کے حوالے سے سپر پاور طاقتوں کے اندازِ نظر کو وسیع ویژن میں بیان کرتا ہے۔ بظاہر اس افسانے کی کہانی یہ ہے کہ شاہدرہ کا ایک پاکستانی نوجوان زمان جو دیارِ غیر (بریڈفورڈ) میں دولت کے حصول کے لیے مقیم ہے۔ اور پھر عام روش کے مطابق شراب و شباب کا رسیا ہو کر پاکستان میں اپنے والدین اور اہلِ خانہ کو بھول کر وہیں بس جاتا ہے۔ اپنی سالانہ دو ہفتوں کی چھٹیاں منانے کے لیے علی کانت کے ساحل پر آتا ہے۔ وہ ایک کیمپنگ کمپنی کے میدان میں اپنا خیمہ نصب کرتا ہے۔ اس کے ساتھ کا خیمہ ایک بوڑھے یورپی کا ہے۔ جو خود کو کنگ آف سکاٹ لینڈ کہلاتا ہے۔ وہ ایک خبطی بوڑھا ہے جس نے ایک ایسی مشین ایجاد کر رکھی ہے۔ جس سے مکھیوں کا صفایا ہو سکے۔ ساتھ ہی اس نے ساحلی علاقے کی تمام بلیوں کو مچھلی کے گوشت کا عادی بنا رکھا ہے۔ بلیاں جو گوشت خور ہو چکی ہیں ایک رات گوشت نہ ملنے پر بوڑھے بادشاہ کا ماس کھا لیتی ہیں۔ اس افسانے کی خاص بات وہ نقطہ نظر ہے جس کے تحت مستنصر نے مطلق العنان قوتوں کی اپنے سے کمتر مخلوق کے ساتھ نفرت و بے زاری کا سلوک ہے۔ جہاں کمزوروں کو جینے کا حق دینا ناجائز سمجھا جاتا ہے۔ غیر محسوس انداز میں مکھیوں اور تیسری دنیا کے ممالک کے درمیان مماثلت جوڑی ہے۔ لیکن ظاہر ہے یہ ایک علامتی افسانہ ہے۔ یہ جملے دیکھئے

''مجھے مکھیوں سے شدید نفرت ہے۔ یہ گندگی پھیلاتی ہیں نیچ ذات کی مخلوق اگر ایکا کر کے متحد ہو جائے تو شریف آدمیوں کا جینا دوبھر کر دیتی ہے۔ دوسرے جانوروں کی طرح رہائش ان کا مسلہ نہیں ہے۔ یہ صرف خوراک کی متلاشی ہوتی ہیں صرف پیٹ بھرنا چاہتی ہیں دنیا میں ہر برائی کی جڑ مکھی ہے۔ اسے ختم کر دو تو ہر طرف امن آشتی کا دور دورہ ہو جائے۔ دنیا سدھری ہو جائے۔''

یہ اس استحصالی نظام یا روش کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جس میں تیسری دنیا پر مسلط بڑی طاقتیں غربت اور مہنگائی میں پسے ہوئے طبقے اور ملکوں کے وسائل کو استعمال کرتی ہیں اس مقصد کے لیے وہ تیسری دنیا کے عوام کے

ساتھ مکھیوں کا سا سلوک کرتی ہیں۔ افسانے کے شروع میں ہی مصنف نے وہیل کے شکار کے طریقہ کار کے تحت یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ طاقت خواہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو جائے بہر حال اس کے گرد جال ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ جو کمزوروں کے ہاتھوں سے ہی ان کے گلے کا طوق بن جاتا ہے۔

افسانے میں جا بجا مغربی تہذیب وروایات کو کھل کر بیان کیا گیا ہے۔ ایک ایسی تہذیب جہاں امرد پرستی اور ہم جنس پرستی عام ہو چکی ہے۔ جہاں کے ساحل برہنہ جسموں کی ایک نمائش بن چکے ہیں۔ جہاں پہنچ کر فرزندانِ مشرق بھی اپنی شرم وحیا، روایات کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ افسانے میں سیکس کا حوالہ تو موجود ہے لیکن اس کا بیانیہ اسے لذتیت تک پہنچنے نہیں دیتا۔ مصنف کے پاس مختلف ممالک کی سیاحت کے بعد معلومات کا جو ذخیرہ ہے اس کے اظہار کے لیے مستنصر بہانہ ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔

''ذات کا قتل''، مستنصر کا ایک ایسا افسانہ ہے جو زندگی اور موت سے جڑے کھیل ''بل فائیٹنگ'' پر لکھا گیا ہے۔ دراصل اصول وقواعد کوئی عالمگیر یا آفاقی قوانین نہیں ہیں جن میں ردوبدل نہیں ہو سکتا۔ ہر بڑا فنکار اپنے لیے فن کے نئے معنی متعین کرتا ہے اور جب وہ اپنے عہد کے مقرر کردہ دائروں سے اوپر اٹھتا ہے تب ہی وہ امر ہوتا ہے۔ خلوص اور لگن ہی انسان کو آگے لے جانے کا سبب بنتی ہیں۔ اس افسانے میں بھی مصنف نے اس کھیل کے حوالے سے ایک ایسے فنکار کی کتھا بیان کی ہے جس نے اپنے لیے اصول خود مقرر کیے تھے۔ افسانہ میں دائرے کے اندر گھومنے والے نقادوں پر طنز ہے جو ایک ہی پامال رستے پر چلے جا رہے ہیں۔ کسی نقاد کی اس رائے میں کسقدر سچائی پوشیدہ ہے

''ایک بڑی تخلیق کے وقت فنکار کو اپنی شخصیت سے اوپر اُٹھ جانا چاہیے۔ اگر شخصیت ہو تو''

انتونیوں ایک نوآموز بل فائیٹر ہے۔ بل فائیٹنگ اس کا جنون ہی نہیں بلکہ آبائی پیشہ اور غربت سے نجات کا راستہ بھی ہے۔ آخر اسے بھی حسبِ دستور ایک موقع ملتا ہے وہ بہترین بل فائیٹر ثابت ہوتا ہے۔ لوگ اس کے کھیل سے متاثر ہوتے ہیں مگر ایک نقاد اس کے کھیل کو ناپسند کرتا ہے۔ جس سے اس کا کیریر تباہ ہو جاتا ہے اور وہ دوبارہ گمنامی کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ کیونکہ دوران کھیل ''قصور پادرو کو چہرہ ایک دم مسکراہٹ سے عاری ہو گیا۔ تم نے بل فائیٹنگ کی مقدس روایت کو توڑنے کا جرم کیا ہے۔ ویرنیکا پاس دیتے وقت دائیں کی بجائے تمھاری بائیں جانب تھیں تم نے پنجوں پر گھومتے ہوئے سرخ کپڑا پوری طرح نہیں سمیٹا تھا۔ تمھاری گردن کا زاویہ درست نہیں تھا۔ انتونیوں بل فائیٹنگ کے فن میں بل فائیٹر کو ذات کے اظہار کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔''

اور یوں افسانے کے آخر میں انتونیو ایک بار پھر کھیل پیش کرتا ہے۔ وہ بل فائیٹنگ کا کلاسک انداز پیش

کرتا ہے۔مگر ایک بڑے فنکار کی طرح وہ جدت سے کام لیتا ہے۔وہ کھیل میں محض اپنی ذات کا اظہار ہی نہیں کرتا بلکہ وہ ذات کا قتل بھی کر دیتا ہے۔اس افسانے کی بنت میں مستنصر نے بڑی چابکدستی کا مظاہرہ کیا ہے۔

''گیس چیمبر'' میں بھی تارڑ نے سیاسی جبریت کے بڑھتے ہوئے سائے کو دکھایا ہے۔مستنصر کا یہ افسانہ اپنی واردات میں انوکھا ہے۔ایم نوملود بچے کی آنکھ سے اس دنیا میں بڑھتی ہوئی آلودگی کے زہر کو دکھایا ہے۔نئی آنے والی نسل کو جن مصائب اور مشکلات کا سامنا اس دنیا میں آغازِ حیات سے کرنا پڑتا ہے۔وہ تو وہ ہی بنیادی ضروریات ہیں جو زندگی کے لیے ناگزیر ہیں۔لیکن یہ بنیادی ضروریات بھی کمیاب اور کثافتوں سے بھری ہوئی ہیں۔ایک معصوم بچہ اس کی ضروریات دودھ، ہوا اور نیند ہیں۔ماں کے دودھ کی بجائے اسے ڈبے کا دودھ ملتا ہے۔جو اس کے اندر کثافتوں کو اکٹھا کر رہا ہے۔نیند وہ نہیں کر سکتا کہ ہر وقت شور برپا ہے، سانس وہ نہیں لے سکتا کہ ہوا آلودہ ہے۔

انسان جسقدر تیزی سے فطرت کو تباہ کر رہا ہے اتنی ہی تیزی سے فطرت اس کے خلاف صف آرا ہو رہی ہے۔توازن کی جگہ زندگی کے ہر میدان میں بے اعتدالی آ چکی ہے۔تارڑ کا یہ افسانہ سماجی شعور کو بیدار کرنے اور جھنجوڑنے کی اچھی کاوش ہے۔یہ افسانہ خاصا مئوثر ہے افسانے میں نہ تو واقعات ہیں اور نہ پلاٹ۔نہ کرداروں کی بھرمار ہے۔لیکن بات قاری تک پہنچ رہی ہے۔

''لوہے کا کتا'' میں بھی ایک بار پھر آمریت اور اس کے جلو میں ظلم کے بڑھتے ہوئے سائے کو دکھایا گیا ہے۔اس کا لوکیل دیہات کا ہے۔دیہات کی فضا میں لکھا یہ افسانہ فنی بنت کے حوالے سے انتہائی شاندار ہے۔بوڑھے اور جوان دیہاتی ہمیشہ کی طرح احساسِ ذمہ داری اور تھکن کے بوجھ تلے دبے مقدور بھر کام کر رہے ہیں۔مگر ان کی گردن جو پہلے اپنے ہی فرض کے بوجھ تلے دبی رہتی تھی۔اب ان کے سر پر کھیتوں کا ایک رکھوالا بھی موجود ہے۔جوان کے سر پر سوار ان سے مشقت لے رہا ہے۔یہ بڑا مئوثر افسانہ ہے۔اس کے جملے بڑے نپے تلے ہیں اور فقروں میں بڑی کاٹ ہے۔

ہم اس دھرتی کے جنور ہیں۔ہمیں اس کی خدمت کرنے دو۔ہم نے تمہیں اپنے کھیتوں کی حفاظت کرنے کے لیے منتخب کیا تا کہ اس کی منڈیریں ڈھے نہ جائیں۔ان میں چوہے اور نیولے سوراخ نہ بن لیں۔کوئی شریک پانی کو روک کر اس کا رخ اپنے کھیتوں کی طرف نہ کر لے۔تا کہ تم فصلوں کو چڑیوں اور کالے ڈھور کوؤں سے بچائے رکھو'[۱۶۴]

''اگرچہ وہ ایک اکائی ہیں۔مگر اب دو اکائیوں میں منقسم ہیں۔ایک اکائی مشقتی اور دوسری چھمک والی'[۱۶۶]

جب ملک کے رکھوالے ہی ملک کی ہی حفاظت چھوڑ کر اقتدار اور طولِ اقتدار کی ہوس پال لیں تب ملک یوں ہی پیچھے رہ جاتے ہیں۔

''یارک شائر کی گائے'' انگلستان کے پس منظر میں دو پاکستانی نوجوانوں کا قصہ ہے۔جس میں ایک سادہ لوح فرید ہے جو ہفتہ کی رات رنگین بنانے کے لیے کسی بھی گوری چمڑی کی لڑکی کو ڈھونڈ لیتا ہے۔مگر اس بار اس کی ملاقات جولی سے ہوتی ہے۔جو قطعی خوبصورت نہیں مگر سیدھی سادی لڑکی ہے۔فرید اس کی ملاقات ناصر سے کراتا ہے۔ناصر ایک نوارد پاکستانی ہے۔جو موقع پرست ہے۔اور عام تصورات کے مطابق جو پاکستان کے لوگوں میں پائے جاتے ہیں وہ بھی جولی کی گوری رنگت پر ریجھ جاتا ہے۔اور ناجائز بچے کا تحفہ دے کر بھاگ جاتا ہے انگلستان کے عام قانون کے مطابق سوشل سیکورٹی والے اس سے بچہ لے جاتے ہیں فرید احساسِ جرم کا شکار کر ہو کر جولی سے شادی کر لیتا ہے مگر تب تک بچہ قانوناً کسی اور کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

انگلستانی معاشرے میں پاکستانیوں کے کردار اور ذہنی مزاج کی عکاسی کرتا یہ افسانہ سادہ بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے۔اس افسانے کو پڑھ کر تصنع اور بناوٹ کا احساس ہوتا ہے۔خصوصاً افسانے کے کلائمکس اور انجام کے بار میں قاری کو خود بخود قیاس ہونے لگتا ہے۔

''کوٹ مراد'' ایک اہم کرداری افسانہ ہے۔تارڑ نے ایک بدہیئت شخص ''تھانوں'' کے کردار میں دیہاتی نوجوانوں کی سادہ لوحی کو بیان کیا ہے عام رواج کے مطابق جب تھانوں جیسے سادہ لوح روزی کمانے کے لیے شہروں کا رخ کرتے ہیں تو ان کی سادہ لوحی ان کے لیے مصائب کا در کھول دیتی ہے۔تھانوں جیسا عجیب الخلقت نوجوان جب شہر میں آتا ہے اور پھر چڑیا گھر دیکھنے جاتا ہے تب وہاں کے تماشائی جانوروں کی بجائے تھانوں کو دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔چڑیا گھر کی انتظامیہ اپنے تماشائیوں میں اضافہ کے لیے غیر انسانی سلوک پر اترتی ہے۔تھانوں کو پندرہ روپے روز دے کر اسے پنجرہ میں بند کر دیا جاتا ہے۔جانوروں جیسی حرکات پر مجبور کیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ پاؤں سے چلنا بھول جاتا ہے۔مگر جب یہی تھانوں چلتے پھرتے چڑیا گھر کے ساتھ دیہاتوں کا رخ کرتا ہے تب اس پر اپنی اصلیت کھلتی ہے۔اپنی حیثیت کا ادراک ہوتا ہے۔ایک صبح وہ چڑیا گھر سے فرار ہو جاتا ہے۔آگے اس کا گاؤں کوٹ مراد ہے۔یہ افسانہ اپنے اسلوب میں ایک انتہائی دلچسپ افسانہ ہے۔خالصتاً دیہاتی فضا جس کے بیانیہ میں مستنصر کو کمال حاصل ہے۔تھانوں ایک معصوم فطرت کردار ہے جو شہریوں کی چالاکیوں اور سفاکیوں کو سمجھ نہیں پاتا۔وہ محنت پر یقین رکھتا ہے۔

''وہ رزقِ حلال پر یقین رکھتا تھا۔اسے یہاں بیٹھنے اور ہنسنے کے پیسے ملتے تھے اس لیے

وہ ڈاکرا تا رہا، زور لگا تا رہا۔۔۔اس کی رگیں پھول گئیں۔ چہرہ سیاہ ہونے کی وجہ سے سرخ نہیں ہوسکتا تھا۔اس لیے مزید سیاہ ہوگیا۔اوراسی شام جب چڑیا گھر بند ہوا۔اور جانوروں کی خوراک والے خاکروب نے تھانوں کے آگے دال کی رکابی اور چند روٹیاں ڈالیں تو وہ جانوروں کی طرح ان پر پل پڑا۔''[ص۱۸۹]

''ٹائم مشین'' سائنس فکشن پر مبنی افسانہ ہے۔جس میں ایک انگریز اپنے دوست کو ٹائم مشین کی مدد سے ماضی کی سیر کی دعوت دیتا ہے۔اور غلطی سے پندرہویں صدی کی بجائے بیسیوں صدی کے مشرق جا پہنچتا ہے۔مستنصر نے اس افسانے میں پاکستانی معاشرے اور سماج کی کجرویوں اور کمزوریوں پر طنز کرتے ہوئے بڑے مضحکہ خیز انداز میں پیش کیا ہے۔اس افسانے کا تاثر بالخصوص اپنے اسلوب کی بدولت خاصا غیر مئوثر ہے۔تکنیک اور اسلوب کے لحاظ یہ بڑا کمزور افسانہ ہے۔مستنصر حسین تارڑ کے ان افسانون کے تجزیاتی مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان کے افسانوں میں معاشرتی، سماجی، سیاسی تضادات (خواہ یہ تضادات پاکستانی معاشرے میں ہوں یا تقابلی انداز میں دیگر معاشروں کے ساتھ ہوں) کا اظہار ہوا ہے۔ان کا دیگر سماجوں اور معاشروں کے متعلق علم اپنی جگہ لیکن ان کے افسانوں کے کردار زیادہ تر پاکستانی سماج سے ہی متعلق ہیں اب خواہ وہ پاکستان کا لوکیل ہو خواہ بدیس۔پھر انہوں نے اپنے دور کی پیچیدہ نفسی کا مشاہدہ عالمی تناظر میں کیا ہے۔ان کے افسانوں میں علامت، اساطیر اور وجودی حوالے کہانیوں کی دلچسپی اور اثر پذیری میں اضافہ کرتے نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔فرزانہ سید،نقوش ادب،سنگِ میل پبلشرز لاہور،۲۰۰۲ء،ص۴۹۹

۲۔''ایک عمدہ انسان بہتر لکھاری نہیں بن سکتا''مستنصر حسین تارڑ،انٹرویو،مشمولہ دی ڈان،اشاعت ۱۹فروری ۲۰۰۹ء

۳۔سلیم اختر ڈاکٹر ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ آغاز سے ۲۰۰۰ء تک''سنگِ میل پبلی کیشنز،لاہور،ستائیسواں ایڈیشن،۲۰۰۵ء،ص۵۱۲

۴۔''مستنصر حسین تارڑ سے ملاقات''انٹرویو:عارف وقار مشمولہ تسطیر سہ ماہی،جلد۱۶،شمارہ۲۱ جنوری تا۲۰۱۲ء

۵۔انوار احمد ڈاکٹر،بحوالہ پی ایچ ڈی تھیسس،''اردو مختصر افسانہ اپنے سیاسی و سماجی تناظر میں'' بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان،۱۹۸۳ء،ص۴۶۱

۶۔فرزانہ سید،نقوش ادب،محولہ بالا،ص۵۰۰،۴۹۹

۷۔تارڑ،مستنصر حسین،سیاہ آنکھ میں تصویر،سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور،۱۹۹۹ء،ص۱۷

۸۔''آئیون ڈونیچ کی زندگی کا ایک دن''ممتاز روسی ادیب الیگزنڈر سولزے نٹسن کا ایک مقبول ناول ہے۔جس کے چھے سال بعد انہوں نے اپنا شہرہ آفاق ناول'' کینسر وارڈ'' تصنیف کیا تھا۔یہ ناول پہلی مرتبہ ۱۹۶۲ء میں سویت لٹریری میگزین Novy Mir (New World) میں چھپا تھا۔کہانی ۱۹۵۰ء میں ایک سویت بیگار کیمپ میں آئیون ڈونیچ شوخوف کی زندگی کے اک دن پر مبنی ہے۔آئیون ڈونیچ ایک سیدھا سادا کردار ہے۔اور دس سال کی بامشقت قید کا سزاوار۔سٹالن دور کے جبر کو عیاں کرتی یہ کہانی سوویٹ ادب میں ایک نئے اور خاصے بولڈ موضوع کے ساتھ وارد ہوئی۔سولزے نٹسن نے آئیون ڈونچ کے کردار کی مدد سے حاکمیت کے اس دباؤ کو بیان کیا ہے جس میں انسان کو حیوان کی سطح پر لا کھڑا کیا جاتا ہے۔ایک بیگار کیمپ میں جنگی قیدیوں کی زندگی کس طرح مشقت،جبر کے تحت بسر ہوتی ہے۔جہاں ان کی شناخت محض ان کے اعداد سے ہوتی ہے۔جہاں کے اصول وقوانین ان کی صحت و بیماری کے حوالے سے بھی خاصے سخت ہیں۔اور خوراک ولباس کے معاملے میں بھی ناکافی سہولیات وجہ سے انہیں اپنی بقا کا مسئلہ درپیش ہے۔یہ ناول سولزے نیٹسن کے اولین ناولوں میں سے ایک ہے۔جس پر ۱۹۷۰ میں ایک فلم بھی بن چکی ہے۔جو نیٹ پر دستیاب ہے۔یہ ناول ڈرامہ کی شکل میں بھی منظرِ عام پر آیا اور اس کے متعدد تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔